

میرے عظیم استاذ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی دامت برکاتہم

رکن مجلس عالمہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

استاذ الاساتذہ، رئیس المحدثین، بانی جامعہ فاروقیہ، و صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان، حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ، کی عظیم دینی شخصیت کا دائرہ خدمات بہت وسیع ہے، اور تدریس و تربیت، تحقیق و تصنیف اور تبلیغ و جہاد کے میدانوں میں تو دور دور تک اتنا پھیلا ہوا ہے کہ کسی ایک مضمون میں ان کو سینا مجھ جیسے کوتاہ قلم کے لئے ممکن نہیں۔

حضرت سے بندے کا تعلق اگرچہ گونا گوں جہتوں میں آخر تک رہا لیکن گہرا تعلق جو سب تعلقات پر بھاری ہے ٹائڈ اور شاگردی کا تعلق ہے، وہ میرے انتہائی شفیق و مہربان استاذ تھے، اپنے اسی تعلق کے حوالے سے کچھ حالات و واقعات، اور جذبات و احساس تحریر میں لانا چاہتا ہوں لیکن افسوس کہ بندہ تحریر کے سلسلے میں بہت کوتاہ اور سست واقع ہوا ہے، ڈر ہے کہ اس غیر اختیاری کوتاہی کی وجہ سے اپنے محترم اور عظیم و شفیق استاذ کے بارے میں جو جذبات و احساسات دل میں ہیں ان سب کو بیان کرنے سے بھی بندہ قاصر رہے گا۔ تاہم ”مالا یدرک کُلُّہ لا یتروک کُلُّہ“ کے اصول پر عرض ہے:

بندے کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق کی سعادت اسی سال ملی جب دارالعلوم کراچی، تا تک واڑے سے منتقل ہو کر ایک پرانے گاؤں ”شرانی“ کے قریب لبق و دق صحرا میں قائم ہوا، اس وقت یہاں نہ کورنگی ٹاؤن آباد ہوا تھا، نہ لاندھی کالونی بنی تھی نہ ڈیفینس سوسائٹی کا دور دور تک کوئی تصور تھا، بس جھاڑیوں اور ریت کے ٹیلوں سے اٹا ہوا ریگستان تھا، جو ساحل سمندر تک چلا گیا تھا، کراچی کی آبادی تقریباً بارہ، تیرہ (۱۲، ۱۳) میل کے فاصلے پر تھی، جہاں جانے کے لئے کوئی سڑک بھی نہیں تھی، اسی ریگستان میں اونٹ گاڑیوں کے گزرتے رہنے کی وجہ سے ایک کچی سڑک سی بن گئی تھی، جب ہم یہاں سے گھر جاتے تو کہتے تھے کہ ”کراچی جا رہے ہیں“ اور جب واپس آتے تو کہتے تھے

”شرافی جا رہے ہیں“، بندے کے ساتھ برادر عزیز مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب - حفظہ اللہ - بھی اور ہمارے بھانجے مولانا حکیم سید مشرف حسین صاحب مرحوم بھی منتقل ہوئے، یہاں ہم تینوں کا قیام ایک ہی کمرے میں تھا، یہاں جن اساتذہ کرام سے ہم دونوں بھائیوں کو نیا نیا شرف تلمذ حاصل ہوا وہ تین بزرگ تھے، یعنی حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اکبر علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، اور حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق بھارت، صوبہ یوپی، ضلع مظفرنگر کے ایک قصبے جلال آباد سے تھا، وہیں سے ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے تھے، اور یہاں دارالعلوم ٹنڈوالہ یار (سندھ) کے مدرسے میں کچھ عرصہ فرائض تدریس انجام دینے کے بعد ۵ شوال المکرم ۱۳۷۶ھ کو مع اہل خانہ دارالعلوم کراچی تشریف لے آئے۔ (۱)

ہمارے دینی مدارس کا تعلیمی سال ماہ شوال سے شروع ہو کر شعبان میں ختم ہوتا ہے، اس طرح ہمارا یہ تعلیمی

سال شوال ۱۳۷۶ء سے شروع ہو کر شعبان ۱۳۷۷ء میں ختم ہوا۔ ہم نے اُس تعلیمی سال یعنی ۷۶-۷۷ھ میں حضرت والا سے دو اہم کتابیں پڑھیں، ایک فقہ کی مشہور ترین نصابی کتاب ہدایہ اخیرین، -دونوں جلدیں- یہ درس صبح کے پہلے دو گھنٹوں میں ہوتا تھا، دوسری فلسفہ کی مشہور کتاب میبذی۔

ان دونوں دروس میں بلکہ بعد کے بھی تمام دروس میں پابندی وقت آپ کا خصوصی امتیاز تھا، ناغے اور رخصت لینے سے ہر ممکن اجتناب فرماتے تھے۔ آپ سبق بہت ذوق و شوق سے پڑھاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ طلبہ بھی اُن کا درس بڑے انہماک سے سنتے تھے۔ آپ اس کا خاص اہتمام فرماتے تھے کہ جب تک تمام طلبہ کو بات سمجھ میں نہ آجائے، سبق کو آگے نہیں بڑھاتے تھے۔

ہم نے پچھلے سال ناک وائے میں ہدایہ اولین اپنے عظیم و شفیق اور بہت ہی محبوب استاذ حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب (ٹوکی) رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھی، اُن ہی کے فقہانہ درس سے پہلی مرتبہ یہ بات دل نشین ہوئی تھی کہ علم فقہ انتہائی دقیق اور گہرا ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی دلچسپ فن بھی ہے، جس کے مسائل کی لذت آج بھی ایک قسم کی محویت عطا کر دیتی ہے۔ اسی طرح فلسفہ کا بھی مجھے شوق تو پہلے سے ضرور تھا، مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ اتنا دلچسپ فن ہے، یہ بات حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس ہی سے سامنے آئی، اس کے بعد مجھے فلسفے سے خصوصی لگاؤ پیدا ہوا، اور الحمد للہ جدید فلسفے کے مطالعے کی بھی نوبت آئی، ساتھ ہی یہ بھی

سوال پیدا ہوا کہ لوگ فلسفے کو مشکل فن کیوں سمجھتے ہیں، بلاشبہ یہ دقیق فن تو ضرور ہے لیکن مجھے کبھی مشکل محسوس نہیں ہوا۔ یہ حضرت ہی کے درس کی برکت تھی۔

طلبہ کے ساتھ گفتگو، بے تکلفی، شفقت اور سادگی آپ کے خاص اوصاف ہیں، جن کے باعث سبق کے علاوہ بھی آپ کے ساتھ ملاقات بہت دلکش اور پر لطف ہوتی تھی، آپ کے درس میں ہمیں تھکن کا احساس بالکل نہیں ہوتا تھا۔

اگلے تعلیمی سال ۷۷-۱۳۷۸ھ (جو ”موقوف علیہ“ کا سال تھا) ہمارا کوئی سبق اگرچہ آپ کے پاس نہیں تھا، لیکن ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا شمس الحق خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت کے شاگرد خاص تھے، اور ان دونوں حضرات کا تعلق آپس میں دوستانہ سا تھا، اور تقریباً ایسا ہی تعلق اب ہمارا حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ہو گیا تھا، اس طرح ان دونوں اساتذہ کرام کے ساتھ ہمارے رابطے، بے تکلفی اور میل جول میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

اُس کے اگلے تعلیمی سال ۷۸-۱۳۷۹ھ میں دورہ حدیث میں جامع ترمذی کا سبق ہماری خوش نصیبی سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا۔ اس درس میں حضرت والا نے طلبہ پر ایک خاص عنایت یہ فرمائی کہ پورے درس کی تقریر کا املا کرواتے تھے، چنانچہ اس املا سے جو تقریر درس میری ضخیم کاپی میں تیار ہوئی، بھرحال آج بھی محفوظ ہے اور پانچ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے، آپ کی ہر تقریر و تحریر ہمیشہ نہایت منضبط، مرتب اور لفظی رعایتوں کے ساتھ بہت آسان ہوتی تھی، آخر حیات تک حضرت والا کی پیرانہ سالی کے باوجود آپ کی تحریر کا یہی انداز تھا، بلکہ آپ کی عام فی البدیہہ تقریر کو بھی پیرانہ سالی کے باوجود اگر ضبط تحریر میں لایا جاتا تو کسی لفظ کی کمی بیشی کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ الا ماشاء اللہ۔ کبھی کبھی درس میں آپ کتاب جامع ترمذی کی عبارت خود بھی نہایت خوش الحانی کے ساتھ دیر تک پڑھتے جاتے تھے جس کا لطف آج بھی یاد آتا ہے۔

ترمذی کے سالانہ امتحان کا ایک واقعہ:

اس سال شعبان ۱۳۷۹ھ میں جب سالانہ امتحانات شروع ہوئے تو جامع ترمذی شریف کا امتحان جس دن ہونا تھا وہ ہفتے کا دن تھا، ہم اُس سے پہلے، جمعرات کو حسب معمول ”کراچی“ گئے، ہمارا مکان اس زمانے میں گارڈن ایسٹ میں سبیلہ چوک کے پاس تھا، جمعہ کی سہ پہر کو تقریباً چار بجے ”شرانی“ واپس جانے کے لئے روانہ ہوئے، بس میں لی مارکیٹ پہنچے، وہاں سے باون (۵۲) نمبر بس (جو شرانی گوٹھ والوں ہی کی تھی) پانچ بجے شرانی

گوٹھ کے لئے جایا کرتی تھی، مگر جب ہم پہنچے تو بس بھر چکی تھی بلکہ کچھ لوگ چھت پر بھی سوار تھے، وہ روانہ ہو گئی۔

اب شرانی تک پہنچنا بہت بڑا مشکل مسئلہ تھا، یہ ایک دردناک داستان ہے کہ لی مارکیٹ سے صدر پہنچنے کے بعد ہم نے وہاں سے شرانی گوٹھ (دارالعلوم) تک کا سفر کس طرح طے کیا، کہیں پیدل بھی چل کر اور صحرا کو عبور کر کے رات کو تقریباً بارہ (۱۲) بجے دارالعلوم پہنچے، یہاں سب سو چکے تھے مطبخ بھی بند ہو چکا تھا، کھانا ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا، بھوکے ہی سو گئے، صبح امتحان کی تیاری کی دھن میں ناشتے کا وقت بھی نڈل سا، مقررہ وقت کے مطابق صبح پونے آٹھ بجے امتحان گاہ میں پہنچے، امتحانات کی نگرانی اس زمانے میں عام طور سے اسی استاذ کے ذمے ہوتی تھی جس کے زیرِ درس وہ کتاب رہی ہو، چنانچہ جامع ترمذی کا امتحان تھا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی ہمارے نگران تھے، حضرت استاذ محترم رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے الحمد للہ ہم نے جامع ترمذی بہت شوق اور محنت سے پڑھی تھی، جواب لکھنے بیٹھے تو وقت کا پتہ ہی نہ چلا، شاید بیس، بائیس سے بھی زیادہ صفحے پہلے ہی سوال کے جواب میں لکھے گئے، اور امتحان کا وقت جو غالباً بارہ بجے ختم ہونا تھا وہ سر پر آ گیا لکھنے کے شغف میں بھوک کی طرف بھی دھیان نہیں ہوا حالانکہ اس وقت تک ہم پر تقریباً اکیس گھنٹے کا فائدہ ہو چکا تھا۔

پریشانی اور حضرت والا کی شفقت:

بھوک سے بھی زیادہ پریشانی اس بات کی ہوئی کہ ابھی ایک یاد و سوالات کے جواب باقی تھے جبکہ وقت ختم ہو چکا تھا، ہم نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر تقریباً سرگوشی کے انداز میں درخواست کی کہ وقت میں ہمیں مہلت دے دیجئے، حضرت ذوق و شوق اور محنت سے پڑھنے والے طلبہ کے ساتھ خصوصی شفقت فرمایا کرتے تھے، فرمایا: ٹھیک ہے تم جواب لکھو میں یہیں بیٹھا ہوں، حضرت نے گھر سے اپنا کھانا بھی وہیں منگوایا اس زمانے میں صرف چند اساتذہ کرام کی رہائش یہاں تھی وہ بھی کچے کچے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں حضرت والا کا قیام ایک چھوٹے سے مکان میں تھا، جو بعد میں کئی سال مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب سکھروی کے زیرِ رہائش رہا، حضرت نے کھانا غالباً ہمارے لئے بھی منگایا تھا، مگر ہم تو شاید جواب لکھنے کے انہماک میں نہ کھا سکے، یہاں تک کہ ظہر کی اذان ہو گئی اور ہم نے اپنے پرچے حضرت کی خدمت میں پیش کر دیے۔ یہ بھی ہم پر حضرت کا اتنا بڑا احسان ہے کہ بھلایا نہیں جاسکتا حالانکہ اس وقت ہم نے حضرت کو اپنی وہ پیتا بھی نہیں بتائی تھی جو اوپر بیان کی۔

دورہ حدیث سے فراغت کے بعد:

دورہ حدیث کے بعد جب ہم پرتد ریس کی ذمہ داری آئی تو اس زمانے میں اگرچہ آپ سے درس کا

تعلق باقی نہ رہا تھا، لیکن شام کو عصر سے مغرب تک ہم دونوں بھائی اور حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت کے گھر پر جمع ہو جاتے اور کبھی گھومنے کے لئے باہر شرانی گونڈھ کے کھیتوں اور باغات وغیرہ میں بھی نکل جاتے، یہ بڑا پر کیف وقت ہوتا تھا، جب حضرت کے دولت خانے پر جمع ہوتے تو حضرت کی طرف سے ہماری ایک خاص تواضع تمباکو والے مزیدار پان سے ہوتی تھی۔ ہمیں پان تمباکو کی عادت مشکوٰۃ (موقوف علیہ) کے سال سے پڑی ہوئی تھی۔

چنانچہ جب کبھی اس طرح کا اجتماع ہمارے کمرے میں ہوتا تو ہم بھی حضرت کی تواضع پان تمباکو سے کرتے تھے۔ یہ عادت ہمیں اس وجہ سے پڑی تھی کہ رات کو اسباق کے تکرار اور مطالعہ کے لئے دیر تک جاگنا ہوتا تھا، اور جب تک منہ میں پان رہے، نیند سے بچے رہتے تھے، دورۂ حدیث کے سال میں یہ عادت مزید بڑھی، اور تدریس کے زمانے میں تو اور بھی پختہ ہو گئی۔ چنانچہ ہمارے پاس بھی ایک پان دان تیار رہنے لگا۔

حضرت کی ایک اور شفقت ”پان کی عیاشی“ :

ہم دونوں بھائی شدت سے محسوس کرتے تھے کہ یہ پان کی عادت صحت کے لئے تو مضر ہے ہی، اس کی ناز برداریوں میں وقت بھی بہت خرچ ہو رہا تھا، کبھی کھانک، چوننا زیادہ، کبھی برعکس، اور کبھی تمباکو مزیدار، کبھی پھیکا، وغیرہ وغیرہ، پھر پانوں کو یہاں لقمہ و دق صحرا میں فراہم کرنا، اور گلنے سے بچانا بھی ایک لبادہ دھندا تھا، کچھ دنوں ہم یہ عادت چھوڑنے کی منصوبہ بندی کرتے رہے، بالآخر ایک دن ہم نے یہ عزم کر کے پان کھانا بالکل چھوڑ دیا کہ اب کبھی نہیں کھائیں گے۔

شام کو حضرت کے پاس حاضری ہوئی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حسب معمول پان دان ہمارے سامنے کر دیا، ہم نے صورتحال عرض کی، تو حضرت خاموش ہو گئے، کئی دن تک اسی طرح ہوتا رہا، اب حضرت صرف اپنے لئے پان لگاتے تھے۔

ایک دن شام کو حاضر ہوئے تو فرمانے لگے: بھئی ایک اہم بات آپ سے کہنی ہے۔ اس وقت حضرت بالکل سنجیدہ تھے، اور چہرے پر کچھ غم کے سے آثار تھے۔ فرمایا: دیکھو بھئی ہم پڑھنے پڑھانے والے لوگ ہیں، دینی مشغلے سے وابستہ ہیں، ہماری کوئی عیاشی نہیں سینماؤں میں ہم نہیں جاتے، کھیل تماشوں میں ہمیں جانے کی فرصت نہیں، شراب بھجھد اللہ ہم نہیں پیتے، کسی قسم کی عیاشی میں ہمارا دخل نہیں، لے دے کہ صرف ایک عیاشی پان کھانے کھلانے کی تھی، وہ تم نے خراب کر دی۔ یہ بات کہتے کہتے حضرت اپنا پان منہ میں ڈال کر دوپان مزید تیار کر چکے۔

تھے، وہ ہماری طرف بڑھادیئے۔ حضرت کا عطیہ تھا کئی دن بعد کھایا تو مزہ بہت آیا، اور پھر وہی عادت دوبارہ چٹنگی کے ساتھ زندگی کا حصہ بن گئی۔ پھر بحمد اللہ اب چند سال سے بندے کی یہ عادت چھوٹ گئی ہے۔ لیکن ایک مرتبہ حضرت کو ان کی وہ نوازش یاد دلائی تو حضرت بہت محظوظ ہوئے۔

اب ان واقعات کو اگرچہ سالہا سال گزر چکے اور دارالعلوم کراچی سے حضرت کا ضابطے کا تعلق بھی کبھی کا ختم ہو چکا ہے، حضرت کا اپنا مستقل ادارہ ”جامعہ فاروقیہ“ ملک کے مشہور و معروف جامعات میں شمار ہوتا ہے، ادھر وفاق المدارس العربیہ پاکستان جیسے ملک گیر عظیم ادارے کی صدارت بھی برسوں سے آخر حیات تک آپ کے ذمہ رہی، ان تمام گراں بار مشاغل کے باوجود ہمارے ساتھ اہم ملکی و ملی معاملات میں مشاورت کا سلسلہ اُسی شفقت اور بے تکلفی کے ساتھ جاری رہا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو افہام و تفہیم کا ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ بڑے سے بڑے اختلافی معاملات میں بھی لوگ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے اور مخالفت کی شدت میں نمایاں کی آجاتی تھی۔

ایک خاص ملکہ جو صرف بڑی شخصیات میں پایا جاتا ہے، آپ کا یہ تھا کہ آپ مختلف الخیال لوگوں کو مشترک مقاصد میں ساتھ لے کر چلنے کے عادی تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے محنت و جفاکشی کی عادت سے بھی مالا مال فرمایا تھا، ان تمام ملکات کا سب سے زیادہ مظاہرہ خاص طور پر وفاق المدارس کی سربراہی میں ہوا۔

وفاق المدارس کو آپ کی سربراہی چھتیس سال حاصل رہی۔ ۳۰ نومبر ۱۹۸۰ء میں آپ کو ناظم اعلیٰ وفاق المدارس مقرر کیا گیا تھا، پھر ۸ جون ۱۹۸۹ء سے وفاق المدارس آپ کی صدارت سے مستفید ہوتا رہا۔ آپ سے پہلے وفاق المدارس عملی میدان میں اتنا پیچھے تھا کہ بہت تھوڑے سے مدارس ہی اس سے ملحق تھے، ملک کے اکثر مدارس اور بڑے بڑے مدارس و جامعات اس سے الگ تھے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی سربراہی میں ہی وفاق المدارس ایک ملک گیر ادارے کی شکل اختیار کر سکا، آپ نے نہایت محنت شاقہ اٹھا کر بے سروسامانی میں ملک کے تمام صوبوں، شہروں دیہات اور کونے کونے میں خود پہنچ کر، دینی مدارس کو ایک کڑی میں پرو دیا، یہ حکیمانہ محنت برسوں جاری رہی، جس کا نتیجہ آج ایک ایسے وفاق المدارس کی شکل میں موجود ہے کہ مسلک دیوبند کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے دینی مدارس و جامعات، مکاتیب قرآنیہ، اور مدارس البنات اس سے باقاعدہ اور باضابطہ ملحق ہیں۔ مسلک دیوبند کے جن مدارس و جامعات کا مختلف جماعتوں اور تنظیموں سے تعلق ہے، وہ بھی وفاق، المدارس کی چھت کے نیچے بالکل ایک ہوتے ہیں

وفاق المدارس کے تحت پورے ملک کے کونے کونے تک پھیلا ہوا انتظام امتحانات بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے

کہ ملک کے تمام سرکاری اور پرائیویٹ امتحانی نظاموں میں ایک ممتاز بلکہ منفرد مقام رکھتا ہے۔

وفاق المدارس کی ان تمام پراعتماد کامیابیوں، ہمہ گیر یوں اور افادیت میں وفاق المدارس کے ناظم اعلیٰ جناب مولانا قاری حنیف جالندھری کی جان توڑ اور حکیمانہ کوششوں کو بھی بہت بڑا دخل ہے، مگر موصوف کی یہ افادیت بھی بڑی حد تک حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کی تربیت اور ہدایات کا عکس ہے۔

بعض دینی و ملکی مسائل میں اور وفاق المدارس کے بعض انتظامی امور اور امتحانی نظام کے بعض مسائل میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ہم ناچیز شاگردوں کو اختلاف بھی پیش آیا، بعض امور کی اصلاح ہو گئی اور بعض امور میں انتظار رہا۔ لیکن ہم تلامذہ پر آپ کی بے تکلفانہ شفقت، اور ناصحانہ و لفرہی میں تاحیات کی نہیں آئی۔

آج جبکہ اس باکمال اور مشفق و محسن استاذ کا سایہ شفقت سر سے اٹھ گیا ہے، یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اچانک ہر طرف دھوپ ہی دھوپ پھیل گئی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ لیکن اللہ کی رحمت سے قوی امید ہے کہ وہ حضرت والا کی برکات سے محروم نہ فرمائیں گے۔ دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت والا کی کامل مغفرت فرمائے، درجاتِ عالیہ سے نوازے، اور ہم سب شاگردوں مستفیدین و متوسلین، اور احباب و اقارب اور سب اہل خانہ کو صبر جمیل اور فلاح دارین عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

یادیں بہت ہیں لیکن حسرت اس پر ہے کہ اپنے شدید عوارض کے باعث بہت کچھ نہ لکھ سکا۔ کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے۔ واللہ المستعان

حاشیہ:

(۱) حساب نکال کر دیکھا تو توشی کیلنڈر کے حساب سے یہ تاریخ ۶ مئی ۱۹۵۷ء بنتی ہے، یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ اس تاریخ سے پورے ۹ سال پہلے جب ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان (کراچی) پہنچے تو وہ بھی ۶ مئی کی تاریخ تھی یعنی ۶ مئی ۱۹۴۸ء۔ اور مزید حسن اتفاق یہ کہ اس وقت جبکہ بندہ یہ سطریں لکھ رہا ہے، یہ بھی ۶ مئی کی تاریخ ہے یعنی ۶ مئی ۲۰۱۷ء۔ مجھ جیسے شاگرد کے لئے اپنے استاذ گرامی سے ایک گونہ مناسبت بھی فال نیک ہے۔ ضمناً عرض کر دوں کہ میری زندگی میں اور بھی کئی اہم خوشگوار واقعات مئی کے مہینے میں پیش آئے ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔